

اُسوہ و سیرت

اخلاقِ نبوت سے اکتسابِ فیض کی

شرط اور علامت

تحریر : پروفیسر حافظ احمد یار

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ (الاعراف: ۱۹۹)
سیرت نگاران رسول ﷺ میں سے ایک سے زیادہ نے اس سوال پر اپنے اپنے رنگ میں بحث کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کی رسالت اور اپنے آخری نبیؐ کی بعثت کے لئے اہل عرب کو ہی کیوں منتخب فرمایا؟ مشہور مصری مؤلف لطفی جمعہ نے اپنی کتاب ”ثورة الاسلام وبطل الانبياء“ کا آغاز ہی اسی طرح کیا ہے:

”دنیا کی تاریخ، انسانی تمدن کی داستان اور قدیم و جدید تہذیبوں کی کہانی میں کتنے ہی قابلِ توجہ واقعات اور پہیلی یا معمہ سے بھی زیادہ حیران کن چیزیں سامنے آتی ہیں جنہیں پڑھ کر یاس کر آدمی محو حیرت رہ جاتا ہے۔ اور اسی قسم کے ناقابلِ فہم معموں میں سے یہ جیساں بھی ہے کہ آخر اللہ نے انوارِ نبوت و رسالت کی تجلی گاہ بنانے کے لئے جزیرۃ العرب کو ہی کیوں منتخب کیا؟“۔^(۱)

اور کچھ آگے چل کر اہل عرب کا عموماً اور قریش کا خصوصاً حوالہ دیتے ہوئے یہی سوال

دہرایا ہے:

”آخر اللہ تعالیٰ نے باقی ساری مخلوقات کو چھوڑ کر ان لوگوں ہی کو کیوں اس دین کا

سرچشمہ اور اس کا مرکز و منبع بنانے کے لئے چن لیا؟“۔^(۲)

اسی طرح سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ کی جلد چہارم میں ”عربوں کی خصوصیات

(۱) ثورة الاسلام وبطل الانبياء: لطفی، ص ۷

(۲) ثورة الاسلام وبطل الانبياء: لطفی، ص ۳۸

اور خیر الام بنے کی صلاحیت“ کے عنوان سے ایک باب میں اس سوال کے جواب سے بحث کی ہے۔ اس موضوع پر تازہ ترین اور بہترین بحث مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب ”نبی رحمت“ میں کی گئی ہے۔ جس کے ایک باب کا عنوان ہے: ”محمد رسول اللہ ﷺ جزیرۃ العرب میں کیوں مبعوث ہوئے؟“۔

اس قسم کے سیرت نگاروں نے اپنی اپنی دانش کے مطابق اس انتخاب ربانی کے لئے اہل عرب کے دنیا کی دوسری قوموں سے زیادہ اہل اور مستحق ٹھہرنے کے مختلف اسباب یا نکات گنوائے ہیں مگر ان سب میں مشترک چیز اہل عرب کی بعض خاص خاص اخلاقی خوبیوں کا ذکر ہے جس نے ان لوگوں کی فطرتِ سلیمہ کو مسخ ہونے سے بڑی حد تک محفوظ رکھا۔

☆ یہ سوال کہ آخر اللہ تعالیٰ نے اس وقت کی تمام مہذب اور متہذ قوموں کو چھوڑ کر عرب کے ان گناہ نشینوں کو اس منصبِ عظیم کے لئے کیوں چن لیا؟ اگر یہی نبی ہندوؤں، بدھوں، یہودیوں یا چینوں، ایرانیوں اور رومیوں میں سے کسی ایک قوم میں مبعوث کر دیئے جاتے تو کیا وہی نتائج حاصل نہ ہوتے اور ویسا ہی انقلاب برپا نہ ہو جاتا جو اہل عرب کے ذریعے سے ہوا؟

☆ جو وقت کی ”بڑی طاقتیں“ (Super Powers) تھیں کیا ان میں سے کوئی بھی ”بہترین“ امت بننے کے فرائض سرانجام نہیں دے سکتی تھی؟

بظاہر یہ سوالات لغو نظر آتے ہیں اس لئے کہ مصالحِ کلیہ الہیہ کا احاطہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور اسی لئے خود قرآن کریم نے اس مسئلہ پر یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ:

﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

”اور اللہ سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کا یہ پیغام کہاں اور کس کے حوالے کیا جائے۔“

تاہم اس اندازِ فکر سے غالباً ایک اور سوال کا جواب سامنے آ سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں آج اللہ کی کتاب اور اس کے آخری نبی ﷺ سے انتساب اور اسلام کے نعرہ ہائے بے حد و حساب اور ان کے فیوض و برکات سے اکتساب کی علامات کیوں نایاب ہوتی جا رہی ہیں؟ کیا ہم کہیں عہدِ جاہلیت کے یہود و ہنود یا روم و عجم کی طرح بعض ایسی بنیادی اقدار سے تو منحرف نہیں ہو گئے جن کو نبوت سے اکتسابِ فیض کی شرط قرار دیا جاسکتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اہل عرب کی جس طرح کا پلٹ دی وہ عجائباتِ تاریخ کا سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ عربوں کی اس قلبِ ماہیت اور تاریخِ عالم کے اس

سب سے حیرت انگیز انقلاب کی اہمیت اور عظمت اور اس کے نتائج کی ہمہ گیری اور وسعت کو سمجھنے کے لئے سیرت نگار ظہور اسلام کے وقت دنیا بھر کی عموماً اور اہل عرب کی خصوصاً دینی، معاشی، سماجی اور اخلاقی حالت بلکہ ان سب حالتوں کی ابتری کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ہمارے موضوع کا تعلق اخلاقی حالت سے ہے۔

عجمی یعنی غیر عرب اقوام کی ناگفتہ بہ اخلاقی حالت کا بیان یوں تو کم و بیش سیرت یا تاریخ کی ہر ایک کتاب میں مل جاتا ہے، لیکن ان تمام اخلاقی خرابیوں کی اصل وجہ کا تجزیہ جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ”حجۃ اللہ البالغۃ“ میں کیا ہے کسی اور کتاب میں اس کی مثال کم ملتی ہے۔ اگرچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے زمانے کی اصطلاحات اور دور کے رسم و رواج کی زبان میں بات کی ہے مگر معنایہ بڑی حد تک آج ہم پر منطبق ہوتی نظر آتی ہے، بلکہ اس میں ہماری اخلاقی بیماری کی کھج تحش نظر آتی ہے۔ حضرت دہلویؒ کا یہ بیان اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ان کے بعد آنے والے مؤلفین کو اس موضوع (چھٹی صدی مسیحی میں اقوام و مذاہب عالم کی حالت) پر لکھتے ہوئے جدید یورپی مطبوعات و تالیفات سے استفادہ اور دائرہ ہائے معارف کے ذریعے اپنی معلومات میں اضافہ کا موقع ملا جن کا شاہ صاحبؒ کے زمانے میں کہیں وجود تک نہ تھا۔ اس لحاظ سے ان کا یہ بیان تاریخ اور فطرت انسانی کے بارے میں ان کے علم لدنی کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی اس ساری تحلیل و تفصیل سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قیث پسندی، تن آسانی اور دنیوی لذائذ و مفاخر کی خاطر تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والے لوگوں کے لئے بحیثیت ایک قوم یا ملت کے (کیونکہ غیر معمولی افراد کی قلیل تعداد تو ہر جگہ ممکن ہے) نبوت سے اکتساب فیض کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، خصوصاً اس درجے کا اکتساب جس سے خیر الام بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے ہرگز ممکن نہیں ہوتا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ مشیت الہی نے ان اقوام کو اس منصب عظیم کا اہل نہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

اب دوسری طرف اگر اہل عرب یعنی ان لوگوں کے قبل از اسلام رذائل و فضائل پر ایک نظر ڈالیں، جو فیضان نبوت کی بدولت بہترین امت بن گئے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی دینی حالت تو ناگفتہ بہ تھی، ان کی اخلاقی حالت بھی سخت دگرگوں تھی۔ اور سیرت نگاروں نے بجا طور پر اسے ”شب ظلمت“، ”عرب کا تاریک دور“ اور ”فساد و بوجھ“ وغیرہ عنوانات

کے تحت اس کی کیفیت بیان کی ہے۔

یہ لوگ بغض و انتقام، سنگدلی و سفاکی، چوری اور رہزنی، قتل و غارت، بے حیائی و بدتمیزی، زنا و فواحش، نسبی تعصب و غرور، قمار بازی، شراب نوشی اور دختر کشی و سود خوری میں قریب قریب ضرب المثل تھے۔ اور ان سب معائب کی تفصیل سے ادب و تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

لیکن سب معائب اور ساری خرابیوں کے باوجود مختلف عوامل نے ان کے اندر بنیادی اور اصولی اخلاق کے احساس کو بالکل مردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ محاسن اخلاق سے یکسر معری نہ تھے بلکہ اخلاقی تعلیمات کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے نظام اخلاق کے بدترین اجزاء میں بھی اخلاقی حسن کی ایک جھلک موجود تھی۔ شراب نوشی اور قمار بازی، فیاضی اور سخاوت کا مظہر تھی۔ دختر کشی کا رواج غیرت کا نتیجہ تھا۔ اور قبائلی عصبيت دراصل قومی حیثیت کی ہی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ غیرت، پابندی، عہد، شجاعت، فیاضی اور صلہ رحمی ان کے معروف اخلاق تھے۔ اسی طرح وہ معروف (بھلائی)، امانت، راست گوئی اور پاکدامنی کو کرم الخلق اور حصال الخیر میں شمار کرتے تھے۔ اور جس آدمی میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اسے تو قیرو و تکریم کا مستحق سمجھتے تھے۔

یہ درست ہے کہ ان کے ہاں اخلاقی حسن کی بنیاد زیادہ تر شہرت طلبی، حب جاہ اور ناموری پر تھی۔ تاہم ان کے اخلاق و اعمال میں ایسے عناصر و اجزاء بھی شامل تھے جنہیں اسلام نے بھی محاسن و مکارم شمار کیا۔ مشہور حدیث ((خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقَّهُوا)) میں اس ”تحويل قبلہ اخلاق“ کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ دوسری جگہ خود حدیث میں ہی خِيَارُكُمْ کی تفسیر ((خِيَارُكُمْ أَحْسَنُكُمْ أَخْلَاقًا)) سے کی گئی ہے۔

دور جاہلیت کے جن واقعات و حوادث میں اہل عرب خصوصاً اہل مکہ کے اخلاقی محاسن کی ایک واضح جھلک نظر آتی ہے اس کی ایک مثال تاریخ نے ”حلف الفضول“ کی صورت میں محفوظ رکھی ہے۔ عبد اللہ بن جدعان کے مکان پر منعقد ہونے والے اسی حلف میں (جس کی وجہ تسمیہ جو بھی ہو) شامل ہونے والے قریش کے بعض خانوادوں کے نمائندوں نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ مکہ میں ظلم و بے انصافی کے واقعات کو محض غیر جانبدار مبصر یا خاموش تماشا کی حیثیت سے نہیں دیکھیں گے، ایک مظلوم کی عملی اور ٹھوس مدد کیا کریں گے۔

یہ حلف جسے سیرت نگار ”اکرم حلف و اشرفہ سمع بہ فی العرب“ (عربوں کی تاریخ کا سب سے شریفانہ اور بہترین معاہدہ) قرار دیتے ہیں، ابن ہشام کے مطابق اس کے اغراض و مقاصد یوں تھے:

”انہوں نے عہد و پیمان باندھا کہ مکہ میں مقامی یا غیر مقامی جس آدمی پر بھی وہ کوئی ظلم ہوتے دیکھیں گے تو وہ سب مل کر مظلوم کی مدد کریں گے اور ظالم کو مجبور کر دیں گے کہ وہ مظلوم پر کئے گئے ظلم کی پوری پوری تلافی کرے۔“ (۱)

کہا جاسکتا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ اس معاہدے کا دائرہ نفاذ بہت محدود تھا، اس کا مقصد صرف حرم مکہ میں مظالم کی روک تھام تھا، اور اس کا فائدہ بھی بالآخر خرابی مکہ ہی کو تھا تا کہ حرم کی عزت و حرمت لوگوں کے دلوں سے کم نہ ہونے پائے، لیکن کیا اپنے وطن عزیز کے کسی ایک شہر بلکہ کسی گاؤں میں بھی اس طرح کا کوئی ادارہ یا تنظیم قائم ہے؟ چلے اپنے وطن یا شہر کی ساکھ کی خاطر ہی سہی۔ حالانکہ ایسا کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔

پھر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس معاہدہ کے شرکاء نے اپنی بات کو صدق دلی اور بے لاگ مصفاۃ نیت کے ساتھ نافذ بھی کیا تھا۔ (۲)

آج یو این اے اور سلامتی کونسل تک میں مہذب ترین لوگ انصاف اور حق کو کس طرح اپنی سیاسی مصلحتوں پر قربان کر دیتے ہیں، اسے سامنے رکھیں تو حلف الفضول منعقد کرنے والوں کی اخلاقی قوت، ان کی فطرت سلیمہ کا وزن اور ان کے اندر خیر الام کے ہر اول دستوں میں شمولیت کے شرف کی اخلاقی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔

آقائے دو جہاںؒ کی عظیم خود بھی (بمصر میں سال) عربوں کے اس سب سے شریفانہ معاہدہ میں شامل ہوئے تھے۔ آپ اس معاہدہ سے بہت خوش تھے اور بعثت کے بعد بھی آپ نے اس کی تعریف و تحسین کی۔

الغرض اگرچہ اہل عرب کی خوبیاں بھی جاہلی رذائل کے خس و خاشاک میں دب کر رہ گئی تھیں، تاہم یہ ثابت ہے کہ ان میں بعض نہایت اچھے اخلاقی اوصاف موجود تھے۔ کم از کم حفاظت حق اور اعانت مظلوم کی حد تک تو آج کی متمدن ترین اقوام بھی ابھی تک عرب جاہلیت سے کچھ نیچے ہی کے درجے پر ہیں۔

(۱) سیرت ابن ہشام

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے: ابن کثیر، جلد اول، ص ۲۵۹-۲۶۱۔

اہل عرب کی مثل ایک ایسی زرخیز زمین کی تھی جو کاشت و بھداشت کے نہ ہونے کے باعث خود رو خاردار جھلڑیوں کا جنگل بن گئی تھی۔ ان میں خیر کے سوتے اٹ ضرور گئے تھے مگر بالکل خشک نہیں ہوئے تھے۔ وہ ایک ایسا بیج تھے جو قوتِ نمو سے محروم نہیں ہوا تھا۔ ہادیٰ برحق نے اس قوم کے ان اخلاقی محاسن کو ترتیب دے کر مکارمِ اخلاق کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ واقعی وہ ایک طرح سے اس کے اہل اور حق دار ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ﴿وَكُنُوزًا أَتَقَىٰ بَهَا وَأَعْلَهَا﴾ (الفتح: ۲۶)

ہمارے اس موقف کہ نبوت سے اکتسابِ فیض کے لئے اخلاقی خوبیاں ایک شرط کی حیثیت رکھتی ہیں کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سب سے پہلے مسلمان ہونے والے لوگ اخلاقی محاسن کے مداح بھی تھے اور ان سے متعصم بھی۔

سب سے پہلے اُمّ المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ دیکھئے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں اپنی پاکیزگی کے باعث ”طاہرہ“ کے لقب سے مشہور تھیں۔ چنانچہ ابن ہشام لکھتے ہیں: ”وہ زمانہ جاہلیت میں اپنی پاکیزگی اور پاکدامنی کے باعث طاہرہ کہہ کر پکاری جاتی تھیں۔“

حضرت خدیجہؓ نے نکاح سے قبل ایک عورت کے ذریعے آنحضرت ﷺ کا عندیہ معلوم کرنے کے بعد آپؐ کو گھر میں بلوایا اور مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنا رشتہ خود پیش کیا:

”اے میرے چچا زاد! میرے اندر آپ کی طرف میلان کئی وجوہ سے پیدا ہوا ہے۔ ازاں جملہ یہ کہ آپ سے میری (برادری کی) رشتہ داری بھی ہے آپ اپنی قوم میں صاحبِ عزت بھی ہیں، ان سب پر مستزاد آپ کی امانت، اخلاص اور راست گفتاری ہے۔“

پہلی وحی کے نزول اور بعثت کے ابتدائی ایام میں جو واقعات و حالات پیش آئے تھے ان کی بناء پر حضرت خدیجہؓ نے آنحضرت ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دی تھی:

”ہرگز نہیں، بخدا اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپ رشتہ داری کا پاس لحاظ کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں محتاجوں کے کام آتے ہیں، مہمان نواز ہیں اور راہِ حق کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں مدد کرتے ہیں۔“

مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے حضرت ابو بکر صدیقؓ تھے۔ ان کے بارے میں سیرت نگار لکھتے ہیں کہ آپؐ ایک بااخلاق اور نیک دل تاجر تھے۔ حضرت ابو بکر

صدیق ؓ کے قبل اسلام اخلاقی محاسن کی ایک گواہی ابن الدغنے کے بیان سے ملتی ہے۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر ابو بکر الصدیق ؓ بھی آنحضرت ﷺ سے اجازت لے کر غالباً حبشہ کی طرف ہجرت کے لئے روانہ ہوئے۔ مکہ مکرمہ سے دو ایک دن کے فاصلے پر انہیں ابن الدغنے ملا۔ (اصل نام سمیعہ بن رفیع تھا اور وہ اس وقت امامیش کا سردار تھا جو ایک مجموعہ قبائل تھا) اس نے پوچھا تم کہاں چلے؟ جب انہوں نے بتایا کہ میری قوم نے مجھے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے اور انہوں نے مجھے بہت ہی اذیت پہنچائی ہے اور سخت مصیبت میں ڈال دیا ہے تو ابن الدغنے نے کہا:

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بخدا آپ تو قبیلہ کے مایہ ناز فرزند ہیں آپ مصیبت زدگان کی مدد کرتے ہیں، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں حصہ لیتے اور محتاجوں کے کام آتے ہیں۔ واپس چلے میں آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔“

ہم ان مثالوں پر اکتفاء کرتے ہیں، ورنہ تمام ”سابقین اولین“ صحابہؓ میں قبل از اسلام ہی کسی نہ کسی خالص اخلاقی خوبی کے وجود پر دلالت کرنے والے واقعات مل سکتے ہیں۔

اور شاید اہل عرب کی محاسن شناسی اور محاسن پذیری کی اس صلاحیت اور اعمال و اخلاق میں حسن و جمال کی ستائش کی اہلیت کی بنا پر ایسا ہی ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاکؐ کے محاسن و فضائل کے جمال بے مثال میں سے آپؐ کے ہم وطنوں کو سب سے پہلے آپؐ کے ”خلق عظیم“ ہی کی وہ جھلک دکھائی جس نے ان کے دل موہ لئے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا قبل از بعثت ہی اپنے نام کے بجائے الصادق اور الامین کے لقب سے پکارا جانا تو سیرت کے مبتدی طالب علم کو بھی معلوم ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کے صاحب خلق عظیم ہونے کا تعلق آپ ﷺ کی قبل از بعثت زندگی سے ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ اخلاقیات نبویؐ کے کسی بھی بیان میں آیت کریمہ ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (کہ آپؐ کی اخلاقی عظمت تو یقیناً ایک مسلمہ امر ہے) کو کورس کے بند کی حیثیت حاصل ہے۔ اس آیت سے اور اس کی تفسیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی مشہور حدیث ”كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ“ (کہ آپؐ کا اخلاق تو قرآن تھا) سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کی تشکیل اور مکارم کی تکمیل قرآن کریم کے ذریعے اور اس کے مطابق ہوئی۔ مگر قابل غور بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ سورۃ القلم کی چوتھی آیت ہے اور اس بات پر قریباً سب اہل علم کا اتفاق ہے

کہ سورۃ القلم لمحاظ نزول قرآن کریم کی دوسری یعنی بالکل ابتدائی دور کی کئی سورت ہے اور یہ آیت مبارکہ ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ آحضرت ﷺ کی نبوت کی صداقت پر سب سے پہلی عقلی دلیل ہے جو قرآن پاک نے پیش کی۔ (اس مضمون کی دوسری آیات جو سورۃ بونس اور سورۃ العنکبوت میں آئی ہیں وہ بھی کئی دور کی ہیں مگر بعد کی ہیں)۔

قرآن حکیم کا آپ ﷺ کے خلق عظیم کو بطور دلیل پیش کرنے سے مدیہ پہلو کے علاوہ چند مزید امور سامنے آتے ہیں، ازاں جملہ:

اڈالیہ کہ ۔۔۔ اہل مکہ (جو جاہلیت عرب کے رذائل و فضائل کے نمائندہ قرار دیئے جا سکتے ہیں) میں اتنی عموماً اخلاقی حس ضرور تھی کہ وہ اخلاقی عظمت پر مبنی اس استدلال سے قائل کئے جا سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ کے اخلاقی عالیہ کی طرف یہ بلیغ اشارہ کرنے کے بعد اسی سورت کی اگلی آیات (۱۰ تا ۱۳) میں یہ بیان ہوا ہے کہ جو آدمی مجموعہ رذائل ہو، چاہے وہ کتنا ہی صاحب جاہ و مال ہو، اسے بچ سمجھو۔ فرمایا:

هَمَّازٌ مَشَاءُ بِنَمِيمٍ * مَنَاعٌ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ

أَتَيْمٌ * عَتَلَ بَعْدَ ذَلِكَ زَيْمٌ * أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ﴿١٤﴾ (القلم: ١٠-١٤)

”ہرگز نہ دباؤ اس شخص سے جو قسمیں کھانے والا، پست فطرت، طعنے جو، چغل خور، مانع خیر، دھاندلی باز، بد عمل، جھاکار اور ساتھ ہی بد اصل بھی ہے، کھنکھاس بنا پر (چوہدری بنا پھرتا ہے) کہ بہت مال والا درکھتا ہے۔“

معلوم ہوتا ہے کہ مخاطبین ”خلق عظیم“ اور ان آیات میں بیان کردہ ”رذائل تسعہ“ کے تغایر و تباہی کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ — اس آیت ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ کے مضمون اور اس کے زمانہ نزول کو سامنے رکھنے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ قبل از بعثت ہی صاحب خلق عظیم تھے۔ محمد عزت دروزہ لکھتے ہیں:

”اور یہ خلق عظیم جس کی بنا پر آنحضور ﷺ اس شانے ربانی کے مستحق ٹھہرے اس سے آپ یقیناً قبل از بعثت آراستہ ہو چکے تھے بلکہ اسی چیز نے آپ کو اس برگزیدگی اور اس منصب عظیم کا اہل بنا دیا تھا اور یوں تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ اس کی رسالت کے لئے کون اور کتنا موزوں ہے۔“

یوں لگتا ہے کہ قرآن کریم نے آنحضور ﷺ کے خلق کی تشکیل یا تکمیل نہیں کی بلکہ اسے

تہ سبجا نمودار کیا ہے۔ قرآن و سنت میں اخلاقیات پر جو کچھ بھی بیان ہوا ہے وہ صرف آنحضرت ﷺ کے خلق عظیم کے خدو خال کی مکمل تصویر کشی ہے۔ اور اسی لئے آپ کی ذات گرامی کو امت کے لئے ”اسوۂ حسنہ“ قرار دیا۔ خود اسوہ کے لفظ میں عمل اور کمال کی موجودگی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

ثالثاً یہ کہ — اتنی بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ نبوت محمدی (علی صاحبہا السلام) کی صداقت پر جملہ عقلی و نقلی دلائل کی تبلیغ و اشاعت مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ اس کے لئے عہد رسالت اور قرن اول کی طرح آج بھی دنیا کے سامنے صرف آنحضور ﷺ کے صرف دو معجزوں کو پیش کرنا کافی ہے۔ ایک قرآن دوسرے اخلاق النبیؐ۔ ابتدائے اسلام میں جو بھی مسلمان ہوا وہ یا قرآن سن کر متاثر ہوا یا نبی کریم ﷺ کا خلق عظیم دیکھ کر۔ اہل مکہ خلق محمدیؐ کا مشاہدہ کر سکتے تھے — مابعد النبیؐ اودار میں دنیا کو اس کا مشاہدہ کرانے کی ذمہ داری امت پر ہے کہ ایک طرف اخلاقیات نبویؐ سے متصف اور متخلق ہونا ہر مسلمان پر (حسب استطاعت) دوسری طرف اخلاقیات نبویؐ کا مطالعہ اور اس کی تبلیغ و اشاعت سب مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔

رابعاً یہ کہ — آج بھی اسلام کی تبلیغ ان ہی لوگوں میں اور ان ہی قوموں میں زیادہ مفید اور موثر ہوگی جن کی اخلاقی حس زندہ ہے۔ نیز یہ کہ اسلام کی اشاعت کے لئے اس کے غلبہ کا ذریعہ ثانی لانے کے لئے اور فیوض و برکات نبوت کو پھیلانے کے لئے صرف اور صرف گمراہی گفتمان پر و پیگنڈ اور اشتہار یا محض مذاکرے اور سیمینار نہیں بلکہ اس کے ساتھ سب کے مشاہدہ و تجربہ میں آنے والی زبردست اخلاقی قوت درکار ہوگی۔ اسلام جہاں بھی پہنچا ہے زیادہ تر صلحائے امت کے اخلاق و کردار کی بدولت پہنچا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ابتدا سے ہی صرف اخلاقی نظریاتی تعلیم نہیں بلکہ عملی اخلاق پر زور دیا اور توحید رسالت، آخرت پر ایمان کی طرح محاسن اخلاق سے عملاً مزین ہونا مسلمان کی ایک لازمی خصوصیت یا بالفاظ دیگر نبوت سے اکتساب فیض کی علامت قرار دیا۔ یوں تو قرآن کریم کی متعدد آیات اور عہد رسالت کے بکثرت واقعات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارنامہ ہائے حیات میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے مگر ابتدائی دور کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ پہلے پانچ یا سات مسلمانوں میں سے ہیں۔ انہوں نے

جب آنحضرت ﷺ کے اعلان نبوت کے بارے میں سنا تو اپنے بھائی کو در یافت احوال کے لئے مکہ بھیجا۔ اس نے واپس جا کر آنحضرت ﷺ کے بارے میں بھائی کو یہ رپورٹ دی تھی: ”وہ بھلائی کا حکم دیتا، برائیوں سے منع کرتا اور مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے۔“

یہاں اخلاق کے ضمن میں ”تعلیم“، ”تلقین“، یا ”تبلیغ“ وغیرہ کی بجائے ”امر“ کا لفظ قابل غور ہے۔ اخلاق کا تعلق محض فکر و دانش سے نہیں قوت عمل سے ہے یہ کچھ پڑھنے کی مشق نہیں بلکہ کچھ کرنے کی تربیت کا نام ہے۔

(۲) ہجرت حبشہ ۵ نبوی میں ہوئی۔ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر بن ابی طالب نے اپنے معروف خطبہ میں جس طرح جاہلیت کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ اسلام کا تعارف کرایا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاقی تربیت اور اصلاح عقائد کا کام ساتھ ساتھ اور ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا، بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نبوت سے اکتساب فیض کے بعد علماءوں کے عقائد و افکار کے ساتھ ان کے اعمال اور اخلاق میں کیا تبدیلی آ جاتی تھی۔ اس خطبہ کے جستہ جستہ فقرے قابل غور ہیں:

کہا: ”اے بادشاہ! ہم پروردہ جاہلیت قوم تھے، توں کو پوجتے، مردار کھاتے اور بے حیائیوں میں مبتلا تھے۔ رشتہ داروں کا حق مارتے تھے اور ہمسایوں کو دکھ دیتے تھے اور ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزور کو پھاڑ کر کھا جاتا۔ پھر اللہ نے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کے خاندان، حسب و نسب اور جس کی سچائی، امانت اور پاکبازی سے ہم پہلے واقف تھے۔ انہوں نے ہم کو ایک اللہ پر ایمان لانے اور صرف اسی کی عبادت کرنے کی دعوت دی اور انہوں نے ہم کو سچ بولنے، امانت ادا کرنے، رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھنے، پڑوسی سے حسن سلوک کرنے، ناجائز اور حرام باتوں اور خوریزی سے پرہیز کا حکم دیا۔ بے حیائی کے کاموں، جھوٹ بولنے اور یتیم کا مال کھانے سے منع فرمایا۔ پس ہم ان پر ایمان لائے اور ان کی پیروی کی جو انہوں نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام مانا اور جو انہوں نے حلال بنایا اس کو حلال تسلیم کیا۔“ (۱)

آنحضرت ﷺ نے مکارم اخلاق کی اہمیت یوں بھی واضح فرمائی کہ بعض دفعہ آپ زمانہ جاہلیت کے اصحاب مکارم و محاسن کی قدردانی فرماتے اور ان کے اخلاقی کردار کو بنظر استحسان دیکھتے تھے۔

عبداللہ بن جدعان (بانی حلف الفضول) کو آپ نے کتنی دفعہ تعریف بھرے الفاظ سے یاد فرمایا، حالانکہ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ جس آدمی نے (ایمان لاکر) زندگی میں ایک دفعہ بھی اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ خَطِيئَتِيْ يَوْمَ الدِّينِ نہ کہا ہو اس کی مغفرت کیسے ہو؟
اس قسم کا ایک واقعہ حاتم طائی کی بیٹی کا ہے وہ اسیر ہو کر جنگی قیدیوں کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی:

”حضور! میرا باپ ہلاک ہو گیا اور قدیہ گزار نہ رہا۔ اگر یہ مناسب جانیں تو مجھے رہا کر دیں اور قبائل عرب میں میری بے عزتی نہ ہونے دیں۔ میں اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی ہوں، میرا باپ لوگوں کو مصیبت سے نکالتا تھا، وہ نیک شہرت کا مالک تھا، مہمان نوازی کرتا تھا اور بھوکوں تنگوں کی ضروریات پوری کرتا تھا اور اس نے کبھی کسی حاجت مند کو خالی نہیں جانے دیا، میں حاتم طائی کی بیٹی ہوں۔“

آنحضور ﷺ نے فرمایا: ”اے بچی! یہ باتیں (جو تو نے بیان کیں) یہی تو ٹھیک ٹھیک اہل ایمان کی صفات ہیں۔ اگر تیرا باپ مسلمان ہوتا تو ہم اس کے لئے دعائے رحمت بھی مانگتے۔“ پھر حکم دیا: ”اسے رہا کر دیا جائے کیونکہ اس کا باپ مکارمِ اخلاق کو پسند کرتا تھا اور اللہ تعالیٰ بھی مکارمِ اخلاق کو پسند فرماتا ہے۔“

یہ سن کر ایک صحابی ابو بردہؓ بن نیار کھڑے ہوئے اور سوال کیا: ”یا رسول اللہ ﷺ کیا مکارمِ اخلاق آپ کو (اس قدر) پسند ہیں؟“ تو آپ نے فرمایا: ”قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، کوئی ایک آدمی بھی جنت میں حسنِ عمل کے بغیر نہیں جائے گا۔“

جب بھی ہم مکارمِ اخلاق اور اخلاقیاتِ نبوی کی بات کرتے ہیں تو اس وقت ہمیشہ تعمیر کردار کا مثبت پہلو مراد ہوتا ہے۔ اس درجہ کے حصول کے لئے منفی پہلو یعنی رذائل سے اجتناب ضروری ہے۔ سزا اور مذمت و ملامت سے بچنا ایک بات ہے مگر انعام اور مدح و ثناء کا ہتھار ٹھہرنا عظیم تر بات ہے۔ قرآن کریم میں تعمیرِ اخلاق کے ان دو مراحل کو ہی ”اجتنابِ کبائر“ اور ”مسابقة الی الخیرات“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اِنْ تَجَنَّبُوا كِبَاۤیْرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا﴾ (النساء: ۳۱)

’جن باتوں سے تم کو منع کیا جاتا ہے اگر تم ان میں سے بڑے بڑے گناہوں سے بچتے

رہو گے تو ہم تمہارے چھوٹے موٹے تصور محو کر دیں گے اور تم کو مقام عزت پر جگہ دیں گے۔“

﴿وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (البقرة: ۱۴۸)
 ”اور ہر ایک (مقام) کا ایک مرکز توجہ (یا رخ نظر) ہوتا ہے جس کی طرف وہ رخ کرتی ہے۔ سو تم نیک کاموں میں سبقت لے جانے کی تگ دو کرو۔“

سیرت النبی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اخلاق کی تربیت اور تکمیل کے لئے اس ترتیب اور تدبیر کو ملحوظ رکھا۔ آپ نے سب سے پہلے ان اصولی اور بنیادی اخلاق پر زور دیا جو کم و بیش ہر معاشرے کے سلیم الفطرت افراد میں پائے جاتے ہیں۔ ایک فطری کشش موجود ہوتی ہے اور ایسے شخص میں نبوت سے اکتساب فیض کی ایک شرط یا اہلیت اور فطری استعداد موجود ہوتی ہے۔

دوسرے درجے پر وہ لوگ آتے ہیں جن میں پہلے سے یہ شرط یا وصف اخلاق عملاً موجود نہ تھا۔ نبی سے متعلق ایمان قائم ہو جانے یعنی اسلام کو قبول کرنے یا اسلام کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ہی یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اب وہ کم از کم ان بنیادی اور اصولی اخلاق کی پابندی لازماً اختیار کریں۔ اسلام لانے کے بعد مسلمان کہلانے کے بعد بھی اخلاق کا روز بروز بہتر نہ ہونا اگر مطلق ایمان کے فقدان کا نہیں تو کم از کم نبوت کے فیض سے محرومی کا نشان ضرور ہے۔

بقول اقبال۔

آنکہ از صدق و امانت بے خبر روز تمہید رسالت بے خبر
 کار او گفتار بے کیفِ عمل او نیامِ علم بے سیفِ عمل
 لذتِ ایمان فزاید در عمل
 مردہ آں ایمان کہ ناید در عمل!

”وہ جو کہ صدق و امانت سے بے خبر ہے گویا رسالت کی تمہید سے بے خبر ہے۔ اس کا کام عمل کے بغیر گفتار ہے اور اس کا علم عمل کی تلوار کے بغیر بے نیام ہے۔ ایمان کی لذت عمل میں آگے بڑھنا ہے۔ وہ ایمان مردہ ہے جس میں عمل نہ ہو۔“
 نبوت سے اکتساب فیض کا بلند ترین مرتبہ مکارم اخلاق ہیں جنہیں مقصود بعثت نبویؐ کہا گیا ہے۔

((الْبَلَاءُ بَعْثُ النَّبِيِّ لَتَنْتَمَّ مَكَارِمُ الْاَخْلَاقِ (وَفِي رِوَايَةٍ) مَحَاسِنِ الْاَعْمَالِ))

”میں مکارمِ اخلاق کو یا محاسنِ اعمال کو مکمل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔“
مگر مسلمان ہوتے ہوئے بھی مکارمِ اخلاق کے اعلیٰ درجے تک نہ پہنچ سکتا فیضِ نبوت سے
یکسر محرومی نہ سہی ”کم نصیبی“ کی علامت ضرور ہے۔ علامہ اقبال نے رموزِ بے خودی میں
گداگر کے واقعہ میں اپنے باپ کی نصیحت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

آنکہ مہتاب از سرانکشش دو نیم
رحمت او عام و اخلاش عظیم
از بہارش رنگ و بو باید گرفت
بہرہ از خلق او باید گرفت!

”جس کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہوا۔ اس کی رحمت عام ہے اور اس کا
اخلاق بہت عظیم (بلند) ہے۔ ان کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنا چاہئے، ان کے
اخلاق سے حصہ حاصل کرنا چاہئے۔“

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم اللہ کے ہاں اپنا درجہ و مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو بس یہ
دیکھ لو کہ تمہارے دل میں اللہ کا درجہ کیا ہے؟ اتنا ہی اس کے ہاں تمہارا درجہ ہے۔ اسی طرح
اگر یہ دیکھنا ہو کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کے ہاں ہمارا کیا درجہ ہے؟ (کیونکہ مصطفیٰ سے بعد ہی تو بولسہی
ہے) تو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ ہم نے اخلاقیاتِ نبویؐ سے کتنا حصہ پایا ہے؟

حافظ صاحب مرحوم کا یہ مضمون ”گودنمنٹ اسلامیہ کالج
سول لائٹز لاہور کے سیرت نمبر (۰۱۹۸۲) میں شائع ہوا تھا۔

قارئین توجہ فرمائیں

بعض کرم فرماؤں کو ماہنامہ ”میتاق“ حکمت قرآن اور مفت روزہ ندائے خلافت کا اجراء یا
تجدید بذریعہ VPP کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں بعض اوقات ہمارے معزز قارئین خود ہی
VPP ارسال کرنے کی فرمائش کرتے اور بعض اوقات ان کے احباب میں سے کسی کی سفارش
پر ایسا کیا جاتا ہے۔ قارئین کرام نوٹ فرمائیں کہ جب تک ادارے کو VPP کی رقم موصول
نہیں ہو جاتی اس وقت تک پرچے کا باقاعدہ اجراء عمل میں نہیں آتا۔ اس سلسلے میں بعض اوقات
4 سے 6 ہفتے بھی لگ سکتے ہیں۔ اگر قارئین کی جانب سے VPP چھڑا لینے کی اطلاع ہمیں
موصول ہو جائے تو (رقم موصول ہونے سے پہلے بھی) پرچے کا اجراء عمل میں لایا جاسکتا ہے۔